نسوانی حقوق کی تحریکات

اُن کے محرّکات اور ان کے ثمرات

(جناب ملک غلام علی صاحب)

ترجمان کے صفحات میں حکومت کی قائم کردہ "حقوق نسواں کمیٹی" کی رپورٹ پر ہمارا تبصرہ و تجزیہ خاصا طویل ہو چکا ہے۔ تاہم اس بحث کے بعض اہم پہلو ابھی تک تشنۂ تکمیل ہیں۔ اب تک کی گفتگو میں جو چیز پیشِ نظر رہی ہے وہ یہ ہے کہ بات کو بہت زیادہ نہ پھیلایا جائے اور کمیٹی نے اپنی سفارشات کا جو حصہ دفعات کی شکل میں مرتب کیا ہے، بحث و نظر کو حتی الامکان اسی تک محدود رکھا جائے۔ لیکن اس رپورٹ کی پشت پر جو عمرانی و تمدنی نظریات کارفرما ہیں اور جن کے برگ و بار ان نظریات کے قائلین و عاملین کو اپنا ذائقہ چکھا چکے ہیں، جب تک ان کی کچھ تفصیل نہ بیان کی جائے، تصویر کا اصل رُخ سامنے نہیں آتا۔ اس لیے اس پس منظر و پیش منظر کی بھی تھوڑی سی توضیح یہاں پیش کی جا رہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس نوعیت کی سفارشات اس کمیٹی نے کی ہیں کوئی حقیقی اجتماعی یا تمدنی ضرورت ان کے لیے داعی نہیں تھی، نہ اُن سے کسی بے انصافی کا ازالہ یا خرابی کی اصلاح مطلوب و متوقّع ہے۔ بلکہ اصل مقصود جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ مغرب میں عورت تن تنہا یا مرد کے ہمراہ جن جن راہوں اور اونچی نیچی گذرگاہوں میں بھٹک رہی ہے پاکستان کی مسلمان خاتون بھی ضرور ان سب راستوں پر رواں دواں اور سرگرداں ہو اور اسی انجام سے دوچار ہو جس سے مغربی دُنیا کی عورت دوچار ہو چکی ہے۔ اس رپورٹ میں جتنی بھی سفارشات اہم اور دُور رس نتائج کی حامل ہیں ان میں ایک بھی ایسی نہیں ہے جسے مغرب کے معاشرے میں آزمایا نہ جا چکا ہو اور جس کے تلخ ثمرات سے وہاں کے کام و دہن اور قلب و دماغ کو پوری طرح سیری نہ حاصل ہو چکی ہو۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہمارے ہاں جو لوگ اس قسم کے تجربات دہرانا چاہتے ہیں وہ ان نتائج و عواقب

سے بے خبر ہیں یا باخبر تو ہیں مگر جان بوجھ کر وہی صورتِ حال اپنے ہاں پیدا کرنا چاہیے ہیں جو مغرب میں رونما ہو چکی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ مغرب زدہ طبقے کی ایک قلیل تعداد کو چھوڑ کر پاکستان کے مسلمانوں کی عظیم اکثریت، خواہ وہ پڑھے لکھے افراد ہوں یا اَن پڑھ ہوں، خواہ عورتیں ہوں یا مرد ہوں، اگرچہ ان پر سے مذہب و اخلاق کی گرفت ایک حد تک ڈھیلی پڑ چکی ہے، لیکن ان کے عادات و اطوار آخری حد تک نہیں بگڑے اور بفضل اللہ وہ دین و دانش سے بالکل بے بہرہ نہیں ہو چکے۔ اس لیے اگر انہیں بتایا جائے کہ مغرب کے صنعتی انقلاب اور فرانس اور روس کے خون آشام حوادث و اضطرابات نے مساوات، حریت وغیرہ کے جو کھوکھلے اور گمراہ کن نعرے ایجاد کیے تھے اور ان کے بل پر جس جنتِ ارضی کو وجود میں لانے کے دعوے اور وعدے کیے تھے وہ سب کے سب سراب سے بھی زیادہ بے حقیقت ثابت ہوئے اور بالآخر انہوں نے روئے زمین کو جہنم زار بنا کر رکھ دیا، تو ہمیں امید ہے کہ مسلمان اس سے عبرت و موعظت حاصل کریں گے۔ اسی امید پر ہم چاہتے ہیں کہ مغرب کے بعض اہل فکر کی کچھ نگارشات ایک مناسب ترتیب کے ساتھ یہاں نقل کریں اور ان کی وساطت سے اپنی بہنوں اور بھائیوں کو غور و فکر کی دعوت دیں۔

سب سے پہلے ہم یونیورسل لائبریری کی شائع کردہ ایک کتاب کے چند اقتباسات دیں گے جس کتاب کا نام "خاتونِ جدید — جنسِ گم گشتہ" (MODERN WOMAN — THE LOST SEX) ہے۔ اس کتاب کے متعلق پہلی قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اسے ایک مرد اور عورت نے مل کر تصنیف کیا ہے، اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ "محض مردانہ یا محض زنانہ نقطۂ نظر" کی حامل ہے۔ یہ کتاب بڑی حد تک ایک متوازن، غیر جانبدارانہ اور معروضی زاویۂ نگاہ سے مرتب کی گئی ہے۔ مرد مؤلف کا نام فرڈی نینڈ لنڈبرگ ہے جو صحافی، ماہر معاشیات، مؤرخ اور سوانح نویس (بیاگرافر) ہیں اور سوشل ہسٹری اور سیاسیات میں لیکچر رہیں۔ عورت کا نام مرینیا، ایف، فارن ہیم ہے جو ایم۔ ڈی اور نفسی و اعصابی امراض کی ماہر طبیبہ ہیں، پرائیویٹ علاج کرتی ہیں، نیز نیویارک کے ایک سرکاری ہسپتال سے منسلک ہیں، لندن اور وائنا کے ہسپتالوں میں بھی تعلیم و تربیت لے چکی ہیں اور صاحبۂ اولاد ہیں۔ یہ کتاب قریب پانسو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے آغاز اور ابوابِ مابعد میں جابجا "نظریۂ مساواتِ مرد و زن"

کا ابطال کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ مرد اور عورت کو ہر حیثیت سے مساوی قرار دینے کے کتنے مہلک نتائج نکلے ہیں۔ چنانچہ صفحہ ۳ کی یہ عبارت ملاحظہ ہو:

"عورت کا وجود مرد کے مقابلے میں پیچیدہ تر ہے۔ عورتوں کو قدرت نے توالد و تناسل کا ایک نازک اور دقیق نظام جسمانی ودیعت کیا ہے جو مرد سے قطعی غیر مشابہ ہے۔ عورت کا اعصابی اور نفسیاتی نظام بھی بہت پُرپیچ اور عمیق ہے جو پورے کا پورا وظیفہ ولادت کے گرد گھومتا ہے جس طرح ایک خطِ مستقیم اور ایک قوس اور مدوّر کمانی میں کوئی مشابہت نہیں، اسی طرح ایک مرد اور عورت میں بھی کوئی باہمی مشابہت نہیں۔"

اس کے بعد صفحہ ۴-۵ پر دکھایا گیا ہے کہ روس میں اشتراکی انقلاب کے بعد نسوانی تحریک FEMINISM بڑے زور شور سے چلی اور عورتوں کے معاملے میں ہر طرح کی بے قیدی اور اباحیت کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ لیکن ۱۹۳۶ء کے بعد یک لخت اس پالیسی میں تغیر رونما ہوا۔ آزاد اور غیر رسمی شادیوں پر قدغن لگائی گئی، طلاق کے حصول کو عملاً ناممکن بنا دیا گیا، اسقاطِ حمل کو ناجائز سمجھا گیا، بچوں سے محروم عورت کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا گیا، اور عائلی زندگی کی خوبیوں اور تقدیس کے سرکاری طور پر گن گائے گئے۔

صفحہ ۱۰ پر ماڈرن عورت کی حالتِ زار ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

"زمانہ جدید کی عورت سے اس درجہ متضاد مطالبات کیے گئے ہیں کہ وہ تفکرات اور اُلجھنوں کا ایک بنڈل بن کر رہ گئی ہے۔ جب تک اس کی جان میں جان ہے، وہ متنوع مصروفیات کے دوران میں شدید مسابقت اور مقابلہ سے دوچار ہے۔ آج کے دور میں وہ گھر سے نکل کر باہر کی دنیا میں آ کھڑی ہوئی ہے۔ اسے خارجی ماحول میں گھسیٹ لانے کا باعث ایک تو صنعتی اور مشینی انقلاب ہے اور دوسری وجہ وہ دانشور اور نظریہ پرست بہنیں ہیں جو اُسے کشاں کشاں اس میدان میں لے آئی ہیں جہاں اس کے لیے مقابلہ ناگزیر ہے اور یہ مقابلہ اب مردوں سے زیادہ خود عورتوں کے ساتھ درپیش ہے۔ ایک وقت وہ تھا جبکہ اُسے اپنے شوہر کے معاملے میں کامل اعتماد تھا اور جدائی کا امکان کم ہی تھا۔ لیکن اب اُسے معلوم ہے کہ کئی عورتیں جو اسٹینوگرافر یا سکرٹری ہیں، ہیٹ چیک کرنے والی یا ماڈل بننے والی لڑکیاں ہیں، یا فیشن کے ڈیزائن تراشتی ہیں یا ویسے ہی مرد کو گھورتی پھرتی ہیں۔ یہ سب

کی سب شادی شدہ عورت کے شوہر کی تاک میں ہیں اور اسے چھین لینا چاہتی ہیں۔ افسانے، ناول، سینما کا یہی موضوع ہے کیونکہ عالمِ واقعات میں یہی کچھ رونما ہو رہا ہے۔ اگر اس کا شوہر نہیں ہے اور اُسے رفیقِ حیات کی تلاش ہے تو وہ یہ جانتی ہے کہ جس چیز کی اُسے تلاش ہے، اور بہت سی عورتیں بھی اُسی کے پیچھے ماری ماری پھر رہی ہیں۔ عورتوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے، وہ کسی جگہ محفوظ و مصئون نہیں بلکہ ان کے غول کے غول شکار کرنے اور شکار بننے کے لیے چار سُو آوارہ پھر رہے ہیں۔ یہ عورتیں چونکہ بآسانی دستیاب ہیں اور جنسی اخلاق سے عاری ہیں، اس لیے مرد اُن کے ساتھ کوئی آخری عہد کرنے اور نباہنے پر آمادہ نہیں ہوتے، اس لیے عورتیں اپنے اندر زیادہ سے زیادہ کشش پیدا کرنے اور بناؤ سنگار رہنیا کرنے کی کوشش میں لگی رہتی ہیں۔ دوسری طرف تلاشِ معاش میں عورتوں کے بالمقابل عورتیں بھی ہیں اور مرد بھی۔ یہ مقابلہ نہایت بے رحم اور جان لیوا ہوتا ہے۔ دفتروں اور کارخانوں کی سیاسیات میں افسری و ماتحتی کے عنصر کے ساتھ ساتھ مردانہ و زنانہ سیاسیات کا بھی دخل ہو جاتا ہے۔ ایسا سخت ہمہ جہتی مقابلہ عورت کو ہر لحظہ مبتلائے تشویش رکھتا ہے"۔

تہذیبِ جدید نے عورت کے اندر جو اس طرح کا ذہنی اضطراب اور اعصابی کھچاؤ پیدا کر دیا ہے، کتاب کے مرتبین کے نزدیک یہ اُن دماغی عوارض، کم سنی کے جرائم، معاشرے کے خلاف نفرت و بغاوت اور قلبی عدمِ سکون کا بنیادی باعث ہے جو مغربی معاشرے پر تیز رفتاری سے چھاتے چلے جا رہے ہیں۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث کے بعد تیسرے باب کا خاتمہ صفحہ ۷۱ پر ان الفاظ میں ہوتا ہے:

"یہ نتیجہ اخذ کیے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے کہ راحت و مسرت کے روز افزوں فقدان کا سبب غربت، بیماری، جسمانی ناکارگی یا عزیزوں کی فوتیدگی نہیں ہے۔ یہ عوارض تو رنج و الم میں صرف اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ یہ غم واندوہ دراصل اعصابی اختلال (NEUROSIS) کا نتیجہ اور خارجی مظاہرہ ہے۔ اور اس اعصابی فساد و اختلال کی پیدائش بچپن میں نامناسب اور نامساعد گھریلو ماحول سے ہوتی ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ عورتیں اور مائیں اس خرابی کی اصل ذمہ دار ہیں"۔

اس کے بعد "گھر کی تباہی" (DESTRUCTION OF THE HOME) کے عنوان سے ایک مستقل باب تحریر کیا گیا ہے جس میں عورت کے گھر سے باہر آنے کے نتائج کو مزید تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ صفحہ ۹۳ پر لکھتے ہیں:-

"صنعتی انقلاب کے ہتھوڑے نے عورت کو ضربیں لگا لگا کر گھر سے نکالا اور مرد کے مشاغل میں عورت کو بھی منہمک کر دیا حالانکہ گھر وہ مقام تھا جہاں عورت نے تہذیب و تمدن کے آغاز سے لے کر اب تک اپنا بہترین مادی و جذباتی سرمایہ لگایا تھا۔ گھر کی تباہی نے صرف عورت ہی کو ناخوش و بے قرار نہیں کر دیا بلکہ پوری سوسائٹی اس سے متاثر ہوئی ہے۔ ایک عمومی ابتری اور افراتفری کے لیے اسٹیج تیار ہو چکا ہے جس کے نتائج ہم سب بھگت رہے ہیں۔ دماغی امراض اور اعصابی عوارض کے مریض جتنی کثیر تعداد میں اب پائے جاتے ہیں تاریخ انسانی میں اس کی مثال نہیں مل سکتی۔"

"آج کا گھر گھر نہیں بلکہ محض ایک رہائش گاہ ہے۔ بعض اسے ایک تغیر پذیر گھر قرار دیتے ہیں مگر یہ محض ایک خوش فہمی اور خیال آفرینی ہے۔ ماڈرن گھر کوئی نشوونما دینے والا ادارہ نہیں بلکہ سماجی نقطۂ نظر سے ایک تخریبی آلہ ہے۔ چنانچہ حاکمانہ طاقتیں اور ایجنسیاں اپنے صحیح یا غلط نظام اجتماعی کے تحفظ کی خاطر ان جدید گھروں کو خود شبہ کی نگاہ سے دیکھتی اور گھر کے افراد کی مخفی مگر کڑی نگرانی کر رہی ہیں۔ ان گھروں میں جو بے اطمینانی اور بے چینی جنم لے چکی ہے اور مزید اجتماعی بدنظمی کے لیے انڈے بچے دے رہی ہے، حکومتیں خواہ کتنی بھی جاسوسی کریں وہ اس کی روک تھام کے لیے ناکافی ہی ہوگی۔ یہاں جذباتی پن کا کوئی سوال نہیں ہے بلکہ یہ ایک حقیقت اور واقعہ ہے جس کا سامنا کرنا ناگزیر ہے"۔

اس کے بعد کتاب میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اس زمانے میں گھر بس سٹاپ یا مسافر خانہ بن کر رہ گئے ہیں جہاں گھر کے افراد فقط نہانے یا سونے کے لیے آتے ہیں، ورنہ دن رات کے بیشتر اوقات ایسے ہوتے ہیں جہاں گھروں میں سناٹا ہوتا ہے، البتہ تھیٹر، قہوہ خانے، شراب خانے، ریسٹوران، رقص گاہیں اور لہو و لعب کے مراکز رات دن آباد رہتے ہیں۔ پھر یہ بیان کیا گیا ہے کہ عورت کے اندر سے بیوی یا ماں بن کر رہنے کا رجحان تیزی سے غائب ہوتا چلا جا رہا ہے اور بچوں کی پیدائش و پرورش کی قدر و قیمت عورت بلکہ پورے معاشرے کی نگاہوں سے گر گئی ہے۔ چنانچہ صفحہ ۱۲۴ پر اس صورت حال کا نفشہ ان الفاظ میں دیا گیا ہے:۔

"چرچ اور ریاست نظریاتی اعتبار سے تو وظیفۂ مادری (MOTHER HOOD) کی بڑی مدح سرائی کرتے ہیں، لیکن ہر دیکھنے والی آنکھ دیکھ رہی ہے کہ ماں بننا اب عورت کو باعث منفعت

نظر نہیں آتا۔ اُس کے ساتھ اب کوئی مرتبہ و منزلت وابستہ نہیں ہے۔ جس طبقے کے ہاتھ میں ذہنی و فکری قیادت ہے اور جو سوچ بچار کے پیمانے فراہم کرتا ہے وہ اب بچے جننے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ جو عورت بچے کے جھنجٹ سے آزاد ہو مگر مجلس قانون ساز کی ممبر، ایڈیٹر، انشاپرداز، ایکٹریس، ملازم، کاروباری ادارے کی منتظمہ یا معلمہ ہو، سوسائٹی اس کا احترام اُس عورت سے زیادہ کرتی ہے جو محض ماں بن کر گھر کی چار دیواری میں رہے۔ آج کل کی عورت کے لیے بے شمار نفسیاتی مشکلات ہیں، لیکن سب سے زیادہ عمیق مشکل اس کے لیے اولاد پیدا کرنا ہے۔ طبی اور اقتصادی نقطۂ نظر سے تو حالات اُس کے لیے نہایت سازگار ہیں لیکن ذہنی اور نفسیاتی لحاظ سے عورت کی راہ میں شدید رکاوٹ حائل کر دی گئی ہے۔ برتھ کنٹرول کے حامی بچوں کی پیدائش کو ہمیشہ ایک معاشی آفت بنا کر پیش کرتے رہتے ہیں جس سے عورت کے ایک فطری فریضے کی بجاآوری میں رکاوٹ اور خلل رونما ہوتا ہے اور اس سے محرومی اُسے دماغی و نفسیاتی امراض کا شکار بنا دیتی ہے۔

ضبطِ ولادت کی تحریک کا جواز ابتدا میں اس بنیاد پر فراہم کیا گیا تھا کہ نسل انسانی جس رفتار سے کرۂ زمین پر بڑھ رہی ہے اس رفتار سے انسانی غذا زمین پر پیدا نہیں کی جا سکتی، اس لیے تحدیدِ نسل ناگزیر ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا نظریہ اور مفروضہ ہے جو تازہ ترین دریافت شدہ حقائق اور معلومات کی بنا پر صحیح ثابت نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں ضبطِ ولادت کے لیے جتنے بھی آلات، تدابیر اور دوائیں ایجاد ہو سکی ہیں ان کا مضرِ صحت ہونا بھی شک و شبہ سے بالاتر نہیں رہا۔ لیکن اسقاطِ حمل اور ضبطِ تولید چونکہ جنسی آوارگی و بے قیدی کا ایک نہایت مؤثر ذریعہ ہے، اس لیے مغربی تہذیب کے دلدادہ مشرقی اور ایشیائی ممالک میں بھی اسے زبردستی رائج کرنے پر مصر ہیں خواہ کوئی قوم اس پر آمادہ ہو یا نہ ہو۔ حال ہی میں اندرا گاندھی کو جو انتخابی شکست ہوئی ہے اُس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اور اس کا لڑکا جبراً نس بندی اور ضبطِ ولادت اپنے ملک پر ٹھونسنا چاہتے تھے۔ ہمارے حکومتی محکمۂ منصوبہ بندی نے بھی اس پروگرام کو بڑے طمطراق سے شروع کر رکھا ہے۔ جا بجا پبلک مقامات پر بڑے بڑے بورڈ آویزاں ہیں جن میں بے شمار بچوں کے سر دکھائے گئے ہیں اور اُوپر جلی عنوان سے تحریر ہے: "اس سیلاب کو روکیے"۔ ایک تصویر میں ایک ٹوکرا اور اس میں ایک درجن بچے دکھائے گئے ہیں اور اسے باپ کی گردن پر لاد کر والدین کو اس بلائے ناگہانی سے ڈرایا گیا ہے۔ یو، این، او، برطانیہ، جرمنی، ناروے، اسٹریلیا، امریکہ سب پاکستان کی آبادی

گھٹانے میں موجودہ حکومت کا ہاتھ بٹا رہے ہیں، کیونکہ تئیس سال میں پاکستان کی آبادی دُگنی ہو جانے کا خطرہ درپیش ہے۔ "حقوق نسواں کمیٹی" بھی عورتوں کے اس بنیادی حق سے غافل نہیں رہی ہے کہ انہیں اضافہ آبادی کے "تخریبی" کام سے ہٹا کر دوسرے "تعمیری" مردانہ مشاغل میں مصروف کیا جائے۔ آخر اس کمیٹی کو اسی حکومت ہی نے تو مقرر کیا ہے جو اپنا فخریہ کارنامہ یہ بیان کرتی ہے کہ "پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کسی عورت کو یونیورسٹی کا وائس چانسلر اور فیڈرل پبلک سروس کمیشن کا ممبر مقرر کیا گیا ہے"۔ چنانچہ کمیٹی کی رپورٹ کے آخر میں خاندانی منصوبہ بندی کے لیے کچھ نئی قانون سازی بھی تجویز کی گئی ہے۔ رپورٹ کی دفعہ ۱۴۔۱۱۱ میں کہا گیا ہے:

"خاندانی منصوبہ بندی کے موضوع پر کمیٹی کی خاص توجہ رہی ہے کیونکہ یہ معلوم ہوا ہے کہ خواتین اسی صورت میں زندگی کے تمام شعبوں میں بھرپور حصہ لے سکتی ہیں اور اپنی معاشرتی اور معاشی حیثیت بلند کر سکتی ہیں جبکہ ہمارے خاندان زیادہ بڑے نہ ہوں۔ قانون سازی کے پہلو پر کمیٹی حسب ذیل سفارش کرتی ہے:

(الف) عام دوا فروشوں کے لیے قانونی طور پر فرض کیا دیا جائے کہ وہ موانع حمل موجود رکھیں اور مذکورہ فرضِ قانونی کو اس کے لائسنس کی شرط قرار دیا جائے۔ علاوہ ازیں شفاخانوں اور اسپتالوں میں موانع حمل کا وافر سٹاک شادی شدہ لوگوں میں فوری تقسیم کے لیے موجود رہنا چاہیے۔

(ب) خاندانی منصوبہ بندی کا مضمون ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے نصاب میں بطور لازمی مضمون شامل کیا جائے۔

(ج) میڈیکل سند یافتگان، مرد اور عورت دونوں، جو ڈاکٹری کی پریکٹس نہ کر رہے ہوں ان کو منصوبہ بندی کی تربیت دی جانی چاہیے اور ہفتہ میں کم از کم دس گھنٹے خدمت انجام دینے پر مجبور کیا جائے۔

(د) مردوں کی شادی کی کم از کم عمر ۱۸ سال سے بڑھا کر اکیس سال کر دینی چاہیے۔"

یہاں ایک نہایت اہم اور انتہائی افسوسناک حقیقت پر سے پردہ اٹھا دینا بھی ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ رپورٹ جب بالکل اپنی آخری شکل میں مرتب ہوئی تو اس میں شفاخانوں اور ہسپتالوں کے ساتھ "گورنمنٹ آفیسز، پرائیویٹ بزنس سنٹرز جہاں دس سے زیادہ افراد کام کرتے ہوں" کے الفاظ بھی موجود تھے، جنہیں عین آخری وقت جب کمیٹی کے چیئرمین نے دستخط کیے ہیں حذف کیا گیا ہے۔ اسی طرح شادی شدہ لوگوں (MARRIED PERSONS) کے الفاظ رپورٹ کے آخری مسودے میں موجود نہیں تھے، ان کا اضافہ بھی بعد میں ہوا ہے۔ اگر کسی صاحب کو ہماری بات پر یقین نہ آئے تو

وہ اسی رپورٹ کا وہ متن ملاحظہ کر لیں جو ۱۹ جولائی ۱۹۶۶ء کے روزنامہ "سن" لاہور میں شائع ہوا ہے۔ یہ اس اصل رپورٹ کی فوٹو کاپی ہے جو اخبار کو مہیا کی گئی ہے۔ اس میں مذکورہ بالا خط کشیدہ الفاظ مطبوعہ موجود ہیں مگر انہیں قلمزد کر دیا گیا ہے اگرچہ بغور دیکھنے سے ان کو بآسانی پڑھا جا سکتا ہے۔ جہاں تک "شادی شدہ" کے الفاظ کا تعلق ہے یہ دفعہ ۱۱۴ میں تو سرے سے موجود ہی نہیں ہیں، البتہ چیئرمین صاحب نے اپنے قلم سے انہیں آگے چل کر اس خلاصے کی دفعہ ۱۳۱ میں بڑھایا ہے جو رپورٹ کے آخر میں بطور ضمیمہ درج ہے۔

آخری مرحلے کی یہ ردّ و بدل اور حذف و اضافہ عیاں کر رہا ہے کہ ان لوگوں کا بس چلے تو یہ پاکستانی قوم کی شرم و حیا اور عصمت و حمیت کا دیوالہ نکال دینا چاہتے ہیں۔ کیا دنیا کے کسی ملک یا قوم میں ایسی مثال موجود ہے کہ وہاں کے ہر میڈیکل اسٹور، شفاخانے، گورنمنٹ کے دفتر اور کاروباری ادارے پر لازم کر دیا گیا ہو کہ وہ مانع حمل آلات اور دوائیں ہر کس و ناکس کو فراہم کرتا رہے؟

ضبطِ ولادت کے حامی چونکہ یہ مسلسل باور کرانے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ مانع حمل دوائیں اور گولیاں بالکل بے ضرر بلکہ محافظِ صحت ہیں، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں روزنامہ سن (لاہور، مورخہ ۱۶ اپریل ۱۹۶۶ء) میں شائع شدہ نیویارک کی تازہ تحقیقاتی رپورٹ کا ضروری حصہ نقل کر دیا جائے جو درج ذیل ہے:

"نیویارک، ۵ اپریل۔ پیورٹو ریکو میں قائم شدہ ایک بڑے دواساز کارخانے میں مانع حمل ادویہ تیار ہوتی ہیں۔ یہاں کام کرنے والے مردوں اور عورتوں کے اجسام میں نسوانی ہارمونوں کی نمایاں کثرت نمودار ہو گئی ہے۔ کیونکہ کارخانے کی فضا اور ہوا جس میں وہ سانس لیتے رہے ہیں اس میں آسٹروجن نامی کیمیاوی مواد سرایت کر چکا ہے۔ نتیجہ: کچھ مردوں کی چھاتیاں غیر فطری انداز میں بڑھ گئی ہیں اور قوت مردمی گھٹ گئی ہے۔ پانچ عورتیں جو برتھ کنٹرول کے لیے مستعمل سفوف کو ہاتھ لگاتی تھیں اور اٹھارہ میں سے دس جو محض تیار شدہ گولیوں کو مس کرتی تھیں ان کے اندام ہائے نہانی سے غیر معمولی طور پر جریان خون شروع ہو گیا۔ ایک سال تک تجرباتی معائنہ و مطالعہ کے بعد اس کے نتائج اٹلانٹا کے وفاقی مرکز میں پیش کیے گئے جو انسدادِ امراض کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر میلکم ہیبرنگٹن جو اس تحقیقات کے نگران تھے، انہوں نے کہا ہے کہ ان گولیوں کی صنعت صحت کے لیے

سنگین خطرات کا باعث ہے۔ ان سے سرطان کی پیدائش کا اگرچہ قطعی ثبوت نہیں مل سکا لیکن میں شک میں مبتلا ہوں۔

انہوں نے مزید بیان کیا کہ جس کمپنی کا اس مطالعہ و تحقیق سے تعلق ہے وہ سفوف کے گرد و غبار کے کنٹرول میں ایک مثالی معیار کی حامل تھی۔ اس کے باوجود بیماری کا وقوع یہ تقاضا کرتا ہے کہ ان کیمیکلز پر قابو پانے کے لیے کوئی نیا طریق کار وضع کیا جائے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وفاقی محکمہ صحت کے ذمہ دار حضرات ایک عرصہ پہلے اس خطرے سے باخبر تھے لیکن گذشتہ مئی سے جو تحقیقات عمل میں آئی ہے اس نے دستاویزی ثبوت بہم پہنچا دیا ہے"۔

اس رپورٹ پر خود کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے ہم یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ اسی اخبار "سن" کے اداریہ کا کچھ حصہ نقل کر دیں جو دوسرے روز ۱۰ اپریل کو اس رپورٹ پر بحث کرتے ہوئے چھپا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ یہ اخبار سرکاری نقطۂ نظر اور پالیسیوں کا بالعموم حامی اور علمبردار ہے۔ اداریے کا عنوان "گولیاں اور انسان" (PILLS AN THE MAN) ہے۔ اس میں جناب مدیر فرماتے ہیں:

"فطرت انسان سے دانا تر ہے۔ فطرت سے جنگ بلاشبہ بے سود ہے۔ اس مزاحمت میں انسان خود ہی مجروح ہوتا ہے۔ انسان فطرت کو رام کرنے کی کوشش کرتا ہے اور آخر کار فطرت اس کی ہنسی اڑاتی ہے۔ انسان اسے قابو میں لانے کے بجائے خود اس کی گرفت میں آجاتا ہے۔ فطرتی حدود کو پھاندنے کے بجائے بہتر یہ ہے کہ اس سے ذرے دور رہا جائے۔ انسان چاہے خارج میں، چاہے اپنے نفس میں جب فطرت کا مقابلہ کرتا ہے مار کھاتا ہے۔ امریکہ کے مرکز انسداد امراض سے جو رپورٹ حال ہی میں ملی ہے وہ یہی کچھ بتاتی ہے۔ برتھ کنٹرول کی دوائیں بنانے والے مرد اور عورتیں امراض کا شکار ہیں۔ ان کی صحت خطرات کی زد میں ہے۔ اگر کیمیاوی عناصر محض ہوا کی وساطت سے انسان کے ظاہر و باطن کو متاثر کر سکتے ہیں تو جو انسان یہ دوائیں کھاتے اور استعمال کرتے ہیں ان پر اور ان کی آئندہ نسلوں پر کیا اثرات مترتب ہوتے ہوں گے؟ رپورٹ کی رو سے وہ فیکٹری جس میں دوائیں بنتی ہیں وہ بخارات و غبارات کے کنٹرول کا مثالی و معیاری بندوبست رکھتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان دواؤں کے خوردبینی ذرات بھی زہر کا اثر رکھتے ہیں۔ ان دواؤں سے کام لینے والے افراد اور ان کے بچے معلوم نہیں اپنے جسم اور خون میں کیا کچھ جذب کرتے اور آگے منتقل کرتے ہوں گے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں سے مابعد کی مردانہ نسل اپنے عادات و اطوار میں زنخہ پن کا روزافزوں مظاہرہ کر رہی ہے اور جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے ان میں نسوانی خصائص کمتر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس رپورٹ سے یہ بھی سبق ملتا ہے کہ قومی صحت ایک ایسا نازک مسئلہ ہے جسے محض محکمہ صحت کے ناخداؤں کے رحم و کرم پہ نہیں چھوڑا جا سکتا۔ بہتر یہ ہے کہ الٹا رُخ اختیار کرنے کے بجائے فطرت کی سیدھی جانب ہی رہنے کی کوشش کی جائے"۔

نت نئے اعداد و شمار کی شعبدہ بازی کے بل پہ یہ پراپیگنڈا بھی دن رات کیا جاتا ہے کہ دنیا بالخصوص مشرقی دنیا میں خوراک کی اتنی قلت ہے کہ بچوں کی پیدائش کو روکا نہ گیا تو انسان انسان کو کھانے لگے گا۔ لیکن اس فریب کا پردہ آئے دن چاک ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً انگلستان کے اخبار گارڈین (مورخہ ۳ جنوری ۱۹۷۶ء) میں ایک مبصر رچرڈ نارٹن ٹیلر کا مضمون چھپا ہے جس میں غذائی قحط کو محض ایک "سکینڈل" ثابت کیا گیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ "دوسری عالمگیر جنگ کے بعد سے دنیا کی غذائی پیداوار میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور ۱۹۴۶ء سے ۱۹۷۶ء تک پیداوار میں ایک سو پچپن فیصد اضافہ ہوا ہے جبکہ دنیا کی آبادی صرف ستر فی صد بڑھی ہے۔ دنیا بھر میں قریب سوا کروڑ ٹن غذا پیدا ہوتی ہے جس کا آدھا حصہ "ترقی یافتہ ممالک" چٹ کر جاتے ہیں حالانکہ ان کی آبادی کل دنیا کا چوتھا حصہ ہے۔ امریکہ کے شعبۂ زراعت کی سال گذشتہ کی ایک رپورٹ کے مطابق جو ممالک غلہ باہر سے درآمد کرتے ہیں ان کی تعداد پچاس ہے جن میں سے چھیالیس کی زرعی پیداوار کو ملکی پالیسی کے طور پر عمداً محدود اور کم کر کے رکھا جاتا ہے۔ چین اور ہندوستان میں انسان جتنی خوراک کھاتے ہیں اتنی ہی خوراک ترقی یافتہ ممالک کے جانور کھاتے ہیں"۔ اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مغربی ممالک ایشیا اور افریقہ کی آبادی کم کرنے کے لیے جو دوائیں یا آلات بطور امداد بھیجنے کی تکلیف گوارا کرتے ہیں اور جو لٹریچر روانہ کرتے ہیں کیا اس کے عوض میں وہ انسانی ہمدردی کے تحت اپنے ہاں کے کتوں، بلیوں، گھوڑوں اور بہت سے دوسرے غیر ضروری پالتو اور جنگلی جانوروں کا خاتمہ یا منصوبہ بندی کر کے اور ان کی خوراک بچا کر مشرقی ممالک کے سپرد نہیں کر سکتے؟ مگر وہ چونکہ جانتے ہیں کہ مانع حمل گولیاں کھلائے بغیر نسوانی حیا کا خاتمہ نہیں ہو سکتا اور مادر پدر آزاد تمدن ان کے حسب منشا برپا نہیں ہو سکتا اس لیے وہ خوراک کی منصفانہ تقسیم سے زیادہ گولیاں اور آئی۔ یو۔ ڈی بانٹنے کی فکر میں ہیں، حالانکہ "غیر متمدن اور غیر ترقی یافتہ" ممالک کے عوام ان عطیات کی وصولی کے لیے تیار نہیں ہیں۔ بھارت کے نئے فیملی پلاننگ کے وزیر نے کہا ہے کہ اس لفظ سے عوام اتنے متنفر ہیں کہ میں محکمے کا نام بدل کر فیملی ویلفیئر رکھنا چاہتا ہوں۔ مگر کیا کسی شے کا محض نام بدل دینے سے اس کی حقیقت بھی بدل سکتی ہے؟